© rasailojaraid.com

اسلام کا معاشی نظریہ

علال الفاسی ــــــــــــــــ ترجمہ: محمود احمد غازی

اسلام کی رو سے مال و دولت ایک ایسی آزمائش ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے ان تصرفات کا امتحان لیتا ہے۔ بنا بریں مال و دولت فی نفسہ قابلِ تعریف چیز نہیں، ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اسے اپنے قبضہ میں لے کر اس سے دوسرے انسانوں کی خدمت، ان کی خوش حالی و بہبود اور رفاہِ عام کا کام لے اور دوسرا اس کے برعکس اسے مخلوقِ خداوندی کو تنگ کرنے، اور تکالیف و نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کرے۔ لہٰذا یہ مسئلہ اس نقطۂ نظر پر موقوف ہے جسے مال کے تصرف کے لئے افراد یا جماعتیں اختیار کرتی ہیں۔ اگر لوگ اُسے اپنے حالات کی بہتری اور اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے محض ایک وسیلہ کے طور پر استعمال کریں تو یہ سراپا نعمت اور لوگوں کے حق میں خیر و برکت بن جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اسے مقصود بالذات قرار دے دیں تو یہ بہت جلد ایک ایسے معبود کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جس کے حصول کے لئے لوگ حق و باطل کی تمیز کئے بغیر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور اس سے کمزوروں کو محروم کر کے صرف ان طاقت وروں کے ہاتھ میں پہنچا دیا جاتا ہے جو اسے ایسے استعمال میں لاتے ہیں جسے فطرتِ سلیمہ اور ضمیرِ پاک قطعاً جائز قرار نہیں دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں ایسی آیات بکثرت ملتی ہیں جو مال و دولت کو آزمائش و امتحان قرار دیتی اور اسے نعمت و فضل سے تعبیر کرتی ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات کو مثال کے طور پہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

هذا من فضل ربي ليبلوني أأشكر أم أكفر (۲۷: ۴۰)

یہ مال و دولت میرے پروردگار کا ایک فضل ہے تاکہ وہ میری آزمائش کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔

واعلموا أنما أموالكم وأولادكم فتنة وأن الله عنده أجر عظيم (۸: ۲۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور تم جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد امتحان کا ذریعہ ہیں اور بے شک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا لنبلوھم ایھم احسن عملا۔ (۱۸/۷)

ہم نے زمین کے اوپر کی تمام چیزوں کو اس کے لئے زینت بنایا، تاکہ ہم ان کا امتحان لیں کہ ان میں سے کس کا عمل بہتر ہے۔

فقلت استغفروا ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا و یمددکم باموال وبنین ویجعل لکم جنات ویجعل لکم انھارا۔ (۷۱/۱۱)

"میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے پروردگار سے بخشش مانگو وہ یقینا بہت بخشنے والا ہے، وہ تم پر کثرت سے بارش بھیجے گا اور مال واولاد کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا تمہارے لئے گھنے باغات بنانے گا اور تمہارے لئے نہریں نکال دے گا۔"

قال اھبطا منھا جمیعا بعضکم لبعض عدو فاما یاتینکم منی ھدی فمن اتبع ھدای فلا یضل ولا یشقی ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا ونحشرہ یوم القیامۃ اعمی (۲۰/۱۲۳-۱۲۴)

"اللہ نے فرمایا کہ تم دونوں جنت سے اتر جاؤ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہو۔ پس اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کا اتباع کیا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بدبختی کی حالت میں رہے گا اور جس نے میری نصیحت سے اعراض کیا تو بے شک اس کی روزی تنگ ہوگی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔"

ان دونوں صورتوں کے درمیان انسان فرطِ حیرت میں کھڑے ہو کر خود سے پوچھتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہئے؟ ایک طرف وہ فطرتِ انسانی اسے اپنی طرف کھینچتی ہے جو اس کے اطمینان اور دنیوی واخروی منفعت کے لئے اسے سرگرم عمل بنانا چاہتی ہے، دوسری طرف اس کی وہ سرشت زور لگاتی ہے جو اس کے دل میں بالادستی اور دوسروں پر برتری کی خواہش پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ اسلام انسان کو زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرح اس پہلو میں بھی اس ناموس الٰہی کا محتاج سمجھتا ہے جس کے سامنے خیر کا شعور بیدار ہو جاتا ہے اور جسے اسلام نے ایسے تقویٰ سے تعبیر کیا ہے جو انسان کے ضمیر میں ایک کسوٹی بن کر فطرت اور [illegible] اس غرض کی تکمیل کے لئے اسلام انسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی دستگیری کرتے ہوئے چیزوں کو حلال قرار دینے میں فطرتِ انسانی کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ آپ کو اس میں کوئی ایسی چیز حرام نہیں ملے گی جسے فطرت حلال کرنے کی متقاضی ہو۔ اسی طرح وہ انسانی سرشت کے ان غیر ضروری تقاضوں کو بھی مدِ نظر رکھتا ہے جنہیں کاٹ چھانٹ کر اس کی آراستگی کی جائے اس لئے کہ اسلام انسانی سرشت کو اپنی مرضی سے بلا قطع و برید پھولنے پھلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مزید برآں اسلام محض حلال و حرام کے اصول ہی متعین نہیں کرتا بلکہ وہ انسانیت کی روح پر اعتماد کرتے ہوئے اسے معاملات میں مکارمِ اخلاق کو معیار قرار دیتے۔ عدل و احسان اختیار کرنے اور صرف قوانین کو سب کچھ نہ سمجھنے اور اخلاقی اصول کو قانون کا اولین مرجع قرار دینے کی دعوت دیتا ہے۔ الغرض اسلام قوت کے استعمال سے قبل وجدان پر زور دیتا ہے۔ ہاں اگر وجدان میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو وہ نفوس کی اصلاح کے سلسلے میں احکام ظاہری کی حفاظت کے لئے حکومت کی مشینری سے بھی کام لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان اجمالی اصول کی تائید کے لئے کتاب و سنت سے مزید دلائل کی حاجت نہیں۔ اس لئے کہ یہ دینی ضروریات ہیں اور یہاں ان کی تشریح بے محل ہوگی۔

مال ایک ذریعہ ہے، لہذا ضروری ہے کہ اسے مقصود بالذات نہ بنایا جائے، یہی وجہ ہے کہ سود کو حرام قرار دینے میں اسلام مسیحیت اور یہودیت کے ساتھ متفق ہے، چنانچہ جب لوگوں نے دعویٰ کیا کہ انما البیع مثل الربا (۲: ۲۷۵) (بیع بھی تو ربا کی طرح ہے) تو قرآن نے جواب دیا کہ ہاں اگر لوگوں کو ان کی طبائع کے مطابق کام کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جاتی اور انسانیت کے تقاضوں کے مطابق انھیں دوسروں کے حقوق کی نگرانی کا پابند اور ان کے اموال کو ناحق کھانے سے منع نہ کیا جاتا تو بے شک ایسا ہی ہوتا، لیکن رحمت خداوندی [illegible] مال داروں کو غریبوں اور [illegible] کسی طرح اجازت نہیں دیتی۔ [illegible] احل اللہ البیع و [illegible] نقد قیمت کو جائز قرار دیا ہے [illegible] امام غزالی نے [illegible] [illegible] دوسری ضروریات کے حصول [illegible] [illegible] انسان [illegible] [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مثال کے طور پر کسی شخص کے پاس کپڑا ہو اور نقدی نہ ہو تو بعض اوقات ممکن ہے کہ وہ اس سے کھانے کا سامان نہ خرید سکے، اس لئے کہ عموماً کھانا کپڑے کے عوض فروخت نہیں ہوتا، اس صورت میں وہ شخص مجبور ہو گا کہ اس کپڑے کو کسی تیسرے شخص کے ہاتھ نقد روپیہ کے عوض فروخت کرے اور اس طرح کھانا حاصل کرنے کے لئے اُسے پہلے مجبوراً نقدی حاصل کرنا پڑے گی۔ معلوم ہُوا کہ دراہم و دنانیر اشیاء ضرورت حاصل کرنے کا صرف وسیلہ ہیں اور مملوکات انسانی میں ان کا مقام وہی ہے جو نحویوں کے قول کے مطابق عبارت میں "حرف" کا ہے، کہ وہ دیگر کلمات میں معنیٰ آفرینی کے لئے استعمال ہوتا ہے، یا پھر آئینہ کی طرح جس کا کام محض رنگوں کی عکاسی ہوتا ہے۔ اب اگر کسی شخص کے پاس نقد روپیہ ہو اور اس کے لئے یہ جائز کر دیا جائے کہ نقد روپیہ کے عوض اسے فروخت کرتا رہے تو وہ نقد روپیہ کے تبادلہ کا کاروبار ہی اس کا مقصود بن جائے گا اس صورت میں نقد روپیہ اس کے پاس رُک کر کنز ہو جائے گا۔ ایک فیصلہ کن اور دوسروں میں گردش کرانے والی قوت کو پابند کر دینا بھی ایسا ہی ظلم ہے جیسا اسے بند کر دینا۔ معلوم ہُوا کہ نقدی کے بدلہ نقدی فروخت کرنے کا اس کے سوا کچھ مقصد نہیں کہ نقدی کی ذخیرہ اندوزی کو مقصود بالذات قرار دے دیا جائے اور یہی ظلم ہے"

اس عبارت سے ہمیں اس عظیم فلسفی کی زبانی حرمت ربا کی غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ مال کو جمع کر کے اس کی ذخیرہ اندوزی نہ کی جائے اور اس مقصد کے لئے بڑے بڑے بنک اور تجوریاں نہ بنائی جائیں کہ پوری قوم کو اس مال کے استفادہ سے محروم کر دیا جائے۔ مالی ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ بحران پیدا ہونے کی وجہ سے اسلام نے ربا کو حرام قرار دیا۔ آج قومی دولت کے بنکوں میں جمع ہو جانے اور اس سے قوم کو فائدہ اُٹھانے کا موقعہ نہ ملنے پر ہمارے سامنے ادیانِ سماوی کے ربا کو حرام قرار دینے کی صحت پر عملی ثبوت فراہم کر دیا ہے، لیکن ربا کے بارے میں دوسرے ادیان میں جو کچھ ملتا ہے اسلام اس کی تنقیح کرتے ہوئے ربا کی دو قسمیں بیان کرتا ہے:

۱۔ **جلی ربا**: جسے نسیئہ بھی کہتے ہیں جو نص قرآنی کی رو سے واضح طور پر حرام ہے۔

۲۔ **خفی ربا**: جو جمہور ائمہ کے قول کے مطابق جلی ربا کے اسباب و ذرائع کو روکنے کے لئے سنت نے حرام کیا ہے اور عندالضرورت مباح کیا جا سکتا ہے۔

آج ہم شیخ محمد عبدہٗ رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ کے مطابق ربا الفضل کے جواز کے قائل ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چونکہ حرمتِ ربا کی وجہ یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی نہ ہونے پائے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ارتکاز دولت کو حرام کیا جائے تاکہ وہ ایک چھوٹی سی جماعت کے ہاتھوں میں نہ رہ جائے جو اُسے آپس ہی میں گھماتی رہے اور پوری اُمت کو اس سے محروم کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے دولت کو صرف مالدار لوگوں کے درمیان گردش کرتے رہنے سے روک دیا اور کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم یعنی "تاکہ وہ مال تمہارے اغنیاء میں ہی گردش نہ کرتا رہے" کا سبب بیان فرما کر مالِ فے کو تمام افراد میں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام واضح طور پر موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو حرام قرار دیتا ہے جس میں دولت کی گردش صرف اغنیاء تک محدود رہتی ہے۔

اسلام ہر شخص کو کمانے کی اجازت ہی نہیں دیتا اس کی ترغیب بھی دیتا ہے بلکہ اسے غنی اور شکر گزار بنانا چاہتا ہے اور اس طرح وہ انفرادی ملکیت کے اصول کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ فرد اپنی کمائی کو اپنی طبیعت اور خواہشات کے مطابق جہاں چاہے خرچ کر ڈالے۔ اسلام کی نظر میں مال تمام امت کی ملکیت ہے۔ ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا (۲/۲۹) "وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے تمہارے سب کے لئے پیدا کیا ہے"۔ دولت چونکہ پوری سوسائٹی کی قوام (اور زندگی کی بقاء کی ضامن) ہے اس لئے اُسے ایسے کسی موقع پر خرچ نہیں کیا جائے گا جس کا نفع ملت کو نہ پہنچتا ہو۔ قرآن ایک موقعہ پہ کہتا ہے: ولا تؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما۔ (۴/۴) "اپنا مال جسے اللہ نے تمہارے لئے بقاء و قیام کا ذریعہ بنایا ہے بے وقوفوں کو نہ دو"۔ گویا یتیموں کا مال ہم سب کا مال ہے اور وہ ہم سب کی ضروریات (یعنی ملی ضروریات) پوری کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مالک یا وصی کے قبضہ میں بطور امانت ہے جس میں سے اسے صرف اسی قدر انتفاع کی اجازت ہے جس قدر پوری ملت کے مفاد کا تقاضا ہو۔ معلوم ہوا کہ اسلام صرفِ دولت کو قانون و شریعت کی رہنمائی میں دینے کے اصول کو تسلیم کرتا ہے اور ارباب حل و عقد کو جائز و ناجائز اخراجات کے سلسلے میں مناسب ہدایات دے دیتا ہے۔ حسب عادت مقتضیاتِ زمانہ کے مطابق بدلنے والی تفصیلات سے تعرض نہیں کرتا۔

اسلام ہر ایسے مالی تصرف کو حرام قرار دیتا ہے جو خود خرچ کرنے والے یا اس کے اقارب یا معاشرہ کے لئے ضرر کا موجب ہو۔ چنانچہ جوا اور شراب حرام ہے، ناجائز جنسی خواہشات پوری کرنے کا مالی معاوضہ حرام ہے، لہو و لعب اور رقص و سرود وغیرہ میں دولت کا ضیاع ممنوع ہے، مردوں کے لئے سونے چاندی کے زیور

[redacted]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ریشم کا لباس پہننا مباح نہیں، مرد و عورت دونوں کو سونے چاندی کے برتن اور دیگر آرائشی سامان کے استعمال کی اجازت نہیں، مساجد و معابد کی آرائش و پچیکاری میں بے جا مقابلہ، مزاروں اور مقبروں پر پختہ عمارتوں کی تعمیر، اور ان میں فنِ تعمیر کے جوہر دکھانا بھی مطلوب نہیں ہے۔ ان کے سوا زیب و زینت اور آرائش کی وہ تمام چیزیں افراد کے لئے جائز ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں اور پاکیزہ روزی میں سے ہیں۔ اس لئے کہ ان چیزوں کے جواز میں صنعت و حرفت کی ترقی اور قومی اقتصادیات کے معیار کی بلندی مضمر ہے۔ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں ہو گی کہ خود تو مکانات کی تعمیر و آرائش اور آلاتِ لہو و طرب کے حاصل میں غلو کرے اور دوسروں کو اپنے اور اپنے بچوں کے لئے سر چھپانے کو چھپر بھی میسر نہ ہو۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کو کیا سزا دی تھی جب انہوں نے اپنے پیغمبر کی اس نصیحت کو نہ مانا تھا:

اتبنون بکل ریع آیۃ تعبثون و تتخذون مصانع لعلکم تخلدون و اذا بطشتم بطشتم جبارین (۲۶/۱۲۸ - ۱۳۰) "کیا تم لوگ بے مقصد کام کرتے ہوئے ہر اونچے مقام پر یادگار عمارتیں بناتے ہو، اور دوام حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے قلعے بناتے ہو، اور جب دگیر کرتے ہو تو جابروں کی طرح دار و گیر کرتے ہو"

یہ لوگ اپنی عیاشی کے لئے راستوں کے کناروں پر فلک بوس عالی شان محلات تعمیر کرتے تھے، جن میں حوض بنواتے اور ایسے مختلف کھیلوں کا انتظام کرتے جن سے غریبوں کو ستایا جاتا، دن بھر بیکار رہ کر اپنے مخصوص برجوں میں بیٹھے کبوتر بازی کرتے یا مختلف جانوروں کو سدھا کر ان سے غریب راہ گیروں کو پریشان کرتے بالکل وہی وطیرہ جیسے آج یورپ کے بہت سے مال دار لوگ غریبوں کو حقیر سمجھتے ہوئے اپنے بنک بیلنس کے بل بوتے پر بیٹھے اپنا وقت طوطے اور بندروں کے پالنے میں ضائع کرتے ہیں۔ یہی صورت قوم عاد کے ان لوگوں کی تھی جو کارخانے بنا کر ان کے مزدوروں پر اپنا حکم چلاتے اور انھیں غلام بنائے رکھتے۔ اور ان کی سختی سے دار و گیر کرتے تھے۔ فصب علیھم ربک سوط عذاب ان ربک لبالمرصاد (۸۹/۱۳-۱۴) "اس لئے تمہارے پروردگار نے ان پر اپنے عذاب کا کوڑا برسایا۔ یقیناً تمہارا رب نافرمانوں کو نگاہ میں رکھتا ہے"

اس سے بھی بڑھ کر اسلام اولوالامر کے لئے ایسے تمام لوگوں کو اپنی دولت کے تصرف سے محروم کر دینا ضروری قرار دیتا ہے جو اپنے مال کو فضول خرچی اور ناجائز طور پر ضائع کرتے ہیں وہ ایسے لوگو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سفہاء قرار دیتے ہوئے انہیں اپنے مال میں تصرف سے روک دیتا ہے اور ضروری سمجھتا ہے کہ انہیں دولت سے بے دخل کردے۔ اور یہ صورت حال اس وقت تک جاری رہے گی کہ حکام ان کی سوجھ اور صحیح تصرف کی طرف سے مطمئن ہو جائیں تب انہیں ان کا مال دے دیا جائے گا۔

انسان کے لئے کمانے اور دولت پیدا کرنے کو اسلام نے نہ صرف مباح بلکہ واجب قرار دیا ہے۔ سان کو بیکار رہنے اور گداگری کو پیشہ بنانے سے روکتا ہے۔ لیکن اسی طرح ضروری ہے کہ کمائی کے ح جائز ہوں، ہر کمائی کا ذریعہ شرعی طریقہ نہیں ہوتا، ہر حرام چیز کا کاروبار بھی حرام ہوتا ہے۔ چنانچہ ب کی تجارت کرنا، جوئے بازی کے اڈے، ناجائز تفریح کے مراکز اور چکلے کھولنا ناجائز ہے۔ طرح قومی مفاد کے خلاف بغیر معاہدے کے اپنے ملک سے دوسرے ملک میں چیزیں منتقل کرنا بھی منع ہے۔

اسی طرح تمام معاملات میں اسلامی ہدایات امت کے مفاد کو ملحوظ رکھتی ہیں۔ لہذا ایک مسلمان نہ اجارہ داری رکھے گا نہ زیادہ قیمت حاصل کرنے کے لئے عوام کی ضرورت کا سامان اپنے پاس روک رکھے گا۔ اسی طرح بہت سے کام اس کے لئے روا نہیں ہوں گے جن میں سے کچھ ہم بعد میں بیان کریں گے۔

الغرض انفرادی ملکیت بنیادی طور پر مباح ہے۔ لیکن مذکورہ بالا محرمات کو دیکھتے ہوئے سوال ہوتا ہے کہ آخر انسان اپنی کمائی کو کہاں خرچ کرے؟ اسلام کہتا ہے کہ فرد بخل اور اسراف دونوں سے بچتے اپنی کمائی کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات میں مناسب اور معروف طریقہ کے مطابق خرچ کرے۔

قل من حرم زينة الله التي أخرج لعباده والطيبات من الرزق (۷/۳۱)

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو زیب و زینت کی چیزیں بنائی ہیں اور جو کچھ اور طیب رزق پیدا کیا ہے وہ کس نے تمہارے لئے حرام قرار دیا؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرد کی جو دولت اس کی ضرورت سے زائد ہو اُسے کہاں لگائے گا اور کدھر کرے گا؟ اسلام اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ انسان اپنے زائد مال کو زراعت، تجارت اور ت بڑھانے والے دوسرے کاروبار میں خرچ کریگا، بشرطیکہ وہ اس سلسلے میں شرعی حدود سے زنہ کرے جن کی رو سے مال محض ایک وسیلہ ہے اور محرمات کو وہ کمائی کا ذریعہ نہ بنائے، اُسے تنہا کاروبار کو انجام دینے اور کسی دوسرے کو اپنے کاروبار میں شریک کرنے کی بھی اجازت ہے لیکن یہ ہے کہ اشتراک کی بنیاد دونوں شریکوں کے درمیان فائدہ اور نقصان میں برابر کی ذمہ داری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہو۔

ان ذرائع سے کام لینے پر لوگوں کے پاس اس قدر نفع جمع ہو جائے کا جو ان کے مالکان کی ضروریات
سے کہیں زائد ہو جائے گا، اور یہی انفرادی ملکیت کی اصل خرابی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام اس
سکل کا کون سا حل پیش کرتا ہے؟ سب سے پہلے اسلام اس سلسلے میں مال کی ذخیرہ اندوزی کو حرام قرار
دیتا ہے، پھر وہ انسان کو اپنی کمائی شرعی اصولوں کے مطابق اولاً اپنی ذات پر خرچ کرنے، پھر جو بچ
رہے اُسے اپنے ضرورت مند والدین و اولاد اور نادار رشتہ داروں پر خرچ کر دینے کی تلقین کرتا ہے۔
پھر اُسے ترغیب دیتا ہے کہ وہ باقی مال کو رضا کارانہ راہ خدا میں صرف کر دے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی
ہوتے ہیں جن پر وعظ و نصیحت اثر نہیں کرتے اور وہ اپنے پاس موجود تھوڑے یا بہت مال کو جمع کر لینا
پسند کرتے ہیں اور اسے ایک پسندیدہ معاشی خوبی سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار
کیا جائے؟

اس مرحلہ پر اسلام ایک عظیم معاشرتی حل پیش کرتا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایسی رقم پر جو دو سو روپے یا
اس سے زائد ہو اور پورے ایک سال تک محفوظ رہے اس کا چالیسواں حصہ یعنی ڈھائی فی صد ادا کر
دیا جائے، یہ اوسطاً وہی رقم ہے جو جمع شدہ دولت کے نفع کے طور پر بنکوں سے ملتی ہے۔ اس لئے
شارع نے ایک طرف تو جمع شدہ مال پر اس نفع کا لینا حرام قرار دیا، اور دوسری طرف اتنی ہی رقم
غرباء و مساکین اور ضرورت مندوں اور قومی مفاد کے لئے ادا کر دینا ضروری قرار دیا۔ اس میں بھی وہی
نظریہ پیش نظر ہے کہ مال سب کا ہے اس لئے اس کی ذخیرہ اندوزی سے وہ فوائد رُک جاتے ہیں جو پوری قوم
کو اس سے حاصل ہوتے، اس لئے فرد اپنا مال جمع تو کر سکتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے لئے یہ بھی ضروری
ہے کہ اپنے مال میں قوم کے دوسرے شرکاء کا بھی حق محفوظ رکھے۔

اس نظام سے جسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے اسلام یہ کام لیتا ہے کہ کوئی رقم غیر مستعمل شکل میں نہ پڑی رہے۔
بلکہ اس نے مال مستعمل بھی بغیر محصول لئے نہ چھوڑا جس سے دوسری ملی ضروریات کے علاوہ ان لوگوں
کی ضروریات بھی پوری کی جائیں گی جو کسی وجہ سے کام کرنے یا کمانے سے معذور ہیں۔ اس لئے اسلام
تمام سامانِ تجارت، جمع شدہ دولت و ذخائر، جائداد اور ایسے زیورات پر بھی جن سے کوئی مالی نفع
حاصل ہو زکوٰۃ شرعی عائد کرتا ہے۔ اس طرح ایک انسان کی ضروریات سے فاضل تمام دولت کا ——

[redacted]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کی قسم اور نوع کے مطابق ـــ ڈھائی سے لے کر دس فی صد تک قومی کاموں میں لگ جاتا ہے۔ فرض کیجئے ہمارے ملک (مراکش) میں وہ تمام دولت جو بنکوں وغیرہ میں جمع ہے یا مختلف کاروباروں میں لگائی گئی ہے دس کھرب فرانک ہے، اس پر جو کم سے کم زکوٰۃ چالیسواں حصہ وصول ہوگی وہ پچیس ارب فرانک ہوگی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ رقم ہر سال وصول کی جائے تو ہمارے معاشرہ کی حالت بہتر بنانے اور ہمارے عوام میں پھیلی ہوئی تین بیماریوں یعنی جہالت، غربت اور بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لئے عظیم الشان بجٹ بن جائے گا۔

لیکن کمزور اور کمانے سے معذور لوگوں کے حقوق دلانے میں اسلام صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اُمت کا فرض ٹھہراتا ہے کہ اس کا ہر فرد کم از کم جینے کے لئے بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، ہر ہم وطن کے لئے ضروری ہے کہ وہ کھائے پیئے، بدن ڈھانکے، سوئے، علاج کرائے اور ضروری تعلیم حاصل کرے، اور پوری اُمت ان سہولتوں کے مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے، اگر زکوٰۃ کی آمدنی کے بعد بھی بیت المال یہ تمام ضروریات پوری نہ کر سکے تو اسلامی حکومت کو حق حاصل ہے کہ غریبوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مالداروں پر مزید ٹیکس لگا دے۔ اس طرح کے زائد ٹیکس لگانے کے جواز کا فتویٰ شیخ مالکی اور امام شاطبی کے علاوہ دیگر علماء نے بھی دیا ہے، بلکہ حضرات فقہاء نے انتہائی تاکید سے لکھا ہے کہ سربراہِ مملکت کی ذمہ داری ہے کہ سماجی انصاف اور کم از کم بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے لئے اُمت کے افراد کے درمیان باہمی امداد و کفالت پیدا کرے خواہ اس مقصد کے لئے اُسے ایک شخص کا کھانا تین آدمیوں میں تقسیم کرنا پڑے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان جسے امام مالک وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے اس مسئلہ کو بخوبی واضح کرتا ہے:

طعام الواحد يكفي الاثنين وطعام الاثنين يكفي الاربعة وطعام الاربعة يكفي الثمانية

ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کو کافی ہو سکتا ہے اور دو آدمیوں کا کھانا چار آدمیوں کو کافی ہو سکتا ہے اور چار آدمیوں کا کھانا آٹھ آدمیوں کو کافی ہو سکتا ہے۔

ابن اثیر نے اس حدیث کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک آدمی کا پیٹ بھر دینے والی خوراک سے دو آدمیوں کا بخوبی گزارہ ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح چار آدمیوں کو سیر کر دینے والی متعدد ... آدمیوں کا بخوبی گذارہ ہو سکتا ہے۔ اسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانہ میں ایک

[redacted]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بر ۔ رمایا تھا:

"میرا ارادہ ہے کہ ہر گھر میں گھر والوں کی تعداد کے برابر لوگوں کو مہمان بنا دوں ۔ اس لئے کہ کوئی ی آدھے پیٹ کھانے سے مر نہیں جاتا۔"

اس سے فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ قحط سالی، بھوک اور افلاس کے دنوں میں حکومت کو ق حاصل ہے کہ وہ مال داروں میں غریب لوگوں کو اس طرح بانٹ دے کہ ان پر ان کی استطاعت ے زیادہ بار نہ بن جائیں ۔ اس مقدار کی تعیین کرتے ہوئے المختصر کے شارحین نے لکھا ہے کہ وہ ب آدمی کی ضروریات سے اور اگر صاحب عیال ہو تو ان کی ضروریات سے زائد بچنے والی تمام دولت ے ، جمہوری کہتے ہیں کہ فضل سے مراد ان ضروریات سے زائد ہونا ہے جن کو پورا کرنے کے لئے آدمی مجبور تا ہے اور جن سے آدمی کی صحت قائم رہتی ہے ۔ نہ کہ کھانے پینے اور دیگر ضروریات سے متعلق انسان ے معمولات جیسا کہ لبساطی اور ابن فجلہ کی عبارت بتا رہی ہے گیارہویں صدی ہجری میں علامہ مسناوی نے بھی اس طرح کی تقسیم کا فتوی دیا تھا ۔ ان کی کتاب نوازل میں ایک طویل فتوی جو تقریباً ایک کالم پر شتمل ہے ہمارے بیان کی تائید کرتا ہے ۔

الغرض ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے مزاج اور تاریخ اسلام میں فقہاء کی دمنیت نے سماجی انصاف کو ہمیشہ وہ مرتبہ بخشا جس کا وہ مستحق ہے ۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم تقسیم دولت کے ان طریقوں پر غور کریں جو ہمارے زمانے کے وسائل سے مطابقت رکھتے ہوں، مثال کے طور پر اگر سابقہ فقہاء نے یہ اجازت دی تھی کہ بعض فقراء کو بعض مال داروں کے ساتھ لگا دیا جائے تاکہ وہ براہ راست ان کی ضروریات پوری کرتے رہیں تو اب ہمیں اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ذریعہ کی تدبیر کرنا چاہیئے، اور اس کی صورت یہ ہو گی کہ مال داروں سے زائد دولت لے کر اس سے غریبوں کی دستگیری کریں یا کوئی اور ایسا طریقہ اختیار کریں جو عوام کی بھلائی اور بہتری کی ضمانت دینے میں زیادہ مفید و مناسب ہو ۔

اسلام اُمت کی نمائندہ حکومت کے فرائض میں یہ بھی شامل کرتا ہے کہ وہ تمام اہل وطن کے لئے بنیادی انسانی ضروریات کی ضمانت دے، لہذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ ایسے سرمایہ دارانہ طریقہ پر مال جمع کرنے سے منع کرتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ فقر و فاقہ، بڑھاپے اور بیماری کے عواقب سے ڈرتے ہیں، ایک تو اس لئے کہ اس میں عدم توکل کا اندیشہ ہے، دوسرے اس لئے کہ اسلام نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناداروں اور محتاجوں کی کفالت کا حق مسلمانوں کے بیت المال کے ذمے ڈال دیا ہے۔ اب جس شخص کو بھی کوئی ضرورت ہوگی حکومت اس کی ضرورت اس مال کے ذریعہ پورا کرے گی جو وہ اس کے غیر محتاج بھائیوں سے وصول کرتی ہے۔ اگر ہم ان تمام حقائق کا ان دوسرے اسلامی حلوں کے ساتھ مطالعہ کریں، جن کا ہم کسی اور موقعہ پر ذکر کریں گے۔ تو ہمیں اسلام کے اس عظیم معاشی نظریہ کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے گا جسے اسلام نے انسانیت کی بہتری اور افراد کی فلاح و بہبود کی خاطر پیش کیا ہے۔

اب رہا اجناس خوردنی اور دیگر اجتماعی ضرورت کی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی جس سے اجارہ داری کی راہ کھلتی ہے یا عوام کو ان کے استفادہ سے روکا جاتا ہے، یا ان کو اس حد تک گراں کر دینا جس سے صارف کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، تو اس قسم کے تمام تصرفات کو اسلام نے قطعاً حرام کر دیا ہے، اور شارع نے ان افعال کے مرتکب پر انتہائی سخت وعید کی ہے، اور حکومت کو اختیار دیا ہے کہ وہ ذخیرہ اندوز کو مجبور کرے کہ وہ اپنے کل ذخیرہ کو نکال کر ان داموں پر فروخت کرے جو حکومت کی رائے میں مالک اور صارفین کے حق میں بہتر ہوں۔ اور یہ کام ان خصوصی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے جو محتسب پر ڈالی گئی ہیں جو معاملات وغیرہ سے متعلق تمام امور کو شرعی احکام کے مطابق نافذ کرانے میں سرکاری وکیل (ATTORNEY GENERAl) کے قائم مقام ہوتا ہے۔ امام مالک نے موطا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"ہمارے بازاروں میں ذخیرہ اندوزی و اجارہ داری (احتکار) کا کام نہیں، جن لوگوں کو اللہ نے فراوانی سے دولت دی ہے انہیں اس کی اجازت نہیں کہ وہ اللہ کے اس رزق کو جو اس نے ہمیں عطا فرمایا ہے، ہم سے روک لیں، جو شخص گرمی سردی کی پرواہ کئے بغیر دور دراز کے علاقوں سے ہمارے یہاں مال لاتا ہے وہ عمرؓ (حکومت) کا مہمان ہے اور اسے اجازت ہے جتنا اللہ چاہے بیچ دے اور جتنا اللہ چاہے روک لے۔"

حضرت عمرؓ کا یہ فرمان بخوبی وضاحت کر رہا ہے کہ تجارت سمیت ہر چیز میں صرف عمل کا اعتبار ہوتا ہے، جو لوگ عوام کی ضرورت کی کھلی منڈیاں چلانے کے لئے گرمی اور سردی کی پرواہ کئے بغیر دوڑ دھوپ کرتے ہیں انہی کو ان منڈیوں میں جمع ہو کر کاروبار کا بھی زیادہ حق حاصل ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنے سرمایہ کو لئے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں اور قیمتیں گرنے کے منتظر رہتے ہیں تاکہ مال خرید کر ذخیرہ کریں اور جب درآمد کم ہو جائے تو صارفین کے سروں پر سوار ہو کر منہ مانگی قیمتیں وصول کر

[redacted]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگوں کا مفاد عامہ کے معاملات میں کوئی مقام نہیں یہ تو ان نشیبوں کی طرح ہیں جو بغیر محنت کئے
ت میں مال و دولت بٹورتے رہتے ہیں۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس حکم کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کے
نشیات اور آپ کی تعلیمات ہی کا نفاذ کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
بئس العبد المحتکر ان ارخص اللہ الاسعار حزن وان اغلاھا فرح۔ اجارہ دار اور ذخیرہ اندوز
ت برا شخص ہے اس لئے کہ جب اللہ بھاؤ سستے کر دیتا ہے تو وہ رنجیدہ ہو جاتا ہے اور جب مہنگائی
دیتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے۔
اور فرمایا — من احتکر علی المسلمین طعاما ضربہ اللہ بالافلاس والجذام۔ جس نے مسلمانوں
ے اجناس خوردنی کی ذخیرہ اندوزی کی اللہ اسے افلاس و جذام میں مبتلا کرے گا۔
اور فرمایا — الجالب مرزوق والمحتکر محروم۔ منڈی میں مال لانے والا آسودہ ہے اور
جارہ دار محروم ہے۔
اور فرمایا — ما من جالب یجلب طعاما الی بلد من بلاد المسلمین فیبیعہ لسعر یومہ
لا کانت منزلتہ عند اللہ منزلۃ الشہید۔ مسلمانوں کے علاقوں میں اجناس خوردنی لانے والا اور
اسے اسی دن کے بھاؤ پر فروخت کر دینے والا اللہ کے نزدیک وہی مرتبہ رکھتا ہے جو شہید کا ہے۔
اور فرمایا — من احتکر طعاما علی امتی اربعین یوما وتصدق بہ لم یقبل منہ۔ جس نے میری
امت کی اجناس خوردنی کو چالیس دن تک ذخیرہ کئے رکھا پھر اگر وہ اس کو راہ خدا میں صدقہ بھی کر
دے تو اس کا یہ صدقہ اللہ تعالیٰ قبول نہ فرمائے گا۔
اور ان کے علاوہ بے شمار احادیث ہیں جو احتکار اور چور بازاری کو ایک زبردست خطرناک سماجی
جرم قرار دیتی ہیں جس کے ارتکاب سے آدمی انسانیت کے مرتبہ سے نکل کر خدا کے غضب اور اس کی
لعنت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ابو المحاسن یوسف الفاسی کے تذکرہ میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب ان کے
زمانے میں فاس میں قحط پڑا تو انہوں نے اپنے گھر کا تمام سامان نکال کر بازار میں فروخت کر دیا اور
کہا کہ ہمیں بھی روزمرہ کی خرید و فروخت میں لوگوں کے مساوی رہنا چاہیئے، ایسا کر کے انہوں نے محض
اپنا فرض ادا کیا جو قحط سالی کے دنوں میں زائد از ضرورت سامان سے متعلق ان پر عائد تھا۔ اس لئے کہ

[redacted]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسی صورت میں ان کے لئے یہ جائز نہ تھا کہ وہ اپنے لئے تو سارے سال کی خوراک اور دوسری ضروریات کا انتظام کرلیں اور دوسروں کو یہ بھی علم نہ ہو کہ وہ اس قحط سالی میں کیا کریں، یہی سبب ہے کہ حریص اجارہ داروں کی گرفت سے نکلنے کے لئے آج کل متمدن ممالک اجناس خوردنی اور دیگر ضروریاتِ زندگی راشن کارڈوں کے ذریعہ تقسیم کرتے ہیں۔

بلاشک اسلامی تعلیمات صرف صارف ہی کی رعایت نہیں بلکہ تاجر کے مفاد کی بھی نگرانی کرتی ہے۔ چنانچہ جو سامان مارکیٹ میں لایا جائے اُس کو اسی روز کے نرخ پر بیچا جائے گا جسے محتسب معیاری قرار دے گا، اور کسی شخص کو اس نرخ میں کمی بیشی کرنے کا اختیار نہ ہوگا اس لئے کہ جس طرح قیمت میں زیادتی سے صارف کا نقصان ہوتا ہے اسی طرح اس میں کمی سے تاجر کا نقصان ہوتا ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے کہ حضرت حاطب ابن ابی بلتعہ بازار میں کشمش فروخت کر رہے تھے کہ حضرت عمرؓ وہاں سے گزرے اور حاطب کو دیکھ کر کہا "یا تو قیمت بڑھاؤ یا ہمارے بازار سے اُٹھ جاؤ"۔

ان تمام تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ مفاد عامہ کے تقاضوں اور ترقی و ارتقاء کی ضرورتوں کا ساتھ دیتے ہوئے اسلام اقتصادی احکام اور معاشی منصوبہ بندی کی اجازت دیتا ہے، گویا اسلام ان کی کسی خاص قسم پر زور نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کے درمیان نرخ مقرر کرنے سے متعلق مسائل میں اختلافات پیدا ہوئے۔ ہمارے نزدیک ان کے یہ اختلافات اصولی نہیں بلکہ زمانوں اور احوال کے اختلاف کی بنا پر تھے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ معاملات کے بارے میں شرعی احکام اقتصادی و اجتماعی ترقی پذیر اقدار کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اگر ہم اس رہنما فکر کو موجودہ زمانہ میں مصالح عامہ کے تقاضوں پر چسپاں کریں تو ہم اس عمومی اصول کے تحت بہت سے فروعی اصول بھی بنا سکتے ہیں، اس طرح ہم تجارتوں اور صنعتوں کو ایسے مقابلے سے بچا سکتے ہیں جو مالکان کارخانہ یا تاجروں یا مزدوروں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص پہلے سے موجود کسی کارخانہ کے قریب ہی کوئی دوسرا بڑا کارخانہ لگائے اور [illegible] مزدوروں کو لگا کر اپنی پیداوار کو ارزاں نرخ پر فروخت کرنا شروع کردے اور اس طرح کم قیمت یا [illegible] پر بیچنے سے اس کا مقصد صرف پہلے کارخانہ کو کمزور کرکے خود اس کی جگہ لینا اور اس کی پیداوار کی بجائے اپنی پیداوار کو فروغ دینا ہو تو حکومت کو چاہیئے کہ پہلے کارخانہ کی پشت پناہی کرے اور دوسرے کارخانہ کو صرف جائز اور معقول مقابلہ کی اجازت دے۔ اسی طرح اگر پہلے کارخانہ کا مالک دوسرے کارخانہ کو تباہ

[redacted]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خت کر دینا چاہے تو ہم معقول شرائط کے بغیر اس سودے کو قبول نہ کریں۔ مثلاً سب سے اہم شرط یہ ہو گی کہ کارخانہ کے مزدوروں کو بیروزگار نہیں کیا جائے گا۔ اگر نام خریدنے والا شخص یہ ذمہ داری قبول کرے تو فبہا ورنہ یہ سودا نامنظور کر دیا جائے۔ اس لئے کہ مزدور کا حق ہے کہ اُسے روزگار مل جائے۔ حکومت معاملات میں اپنے نافذ کردہ اصول و ضوابط کے ذریعے اُسے روزگار کی ضمانت نہیں دیگی تو بیت المال پر بوجھ بن جائے گا یا فقیر بن کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا۔ ان تمام کے تمام معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اصل ہو گا لا ضرر و لا ضرار۔ نہ کوئی نقصان اٹھائے اور نہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچائے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کس طرح قوم کے افراد کے درمیان معاشی توازن برقرار رکھتا ہے اور حتی الامکان افراطِ زر اور دولت کی تباہ کاریوں سے روکنے کی کوشش کرتا ہے ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ فرد کی جمع کی ہوئی دولت وہ کس خوش اسلوبی سے تقسیم کراتا ہے۔ وہ اس مقصد کے لئے احتکار کو ممنوع ٹھہراتا ہے اور دولت اور دوسرے سامانوں پر زکوٰۃ وغیرہ عائد کر کے جمع مال اور ارتکازِ دولت کو روکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر وہ انفرادی دولت کے ارتکاز کو ختم کرنے اور اُسے تقسیم کرنے کے لئے اسلامی نظامِ میراث نافذ کرتا ہے۔ دوسری قوموں کے تمدنی اور مذہبی نظاموں میں تمام میراث سب سے بڑے بیٹے کی ملک قرار دی جاتی ہے تاکہ تمام جائداد و دولت یکجا رہے۔ یہاں تک کہ لوئی بلاں نے اپنی مسیحی اشتراکی اصلاحات میں تمام دولت بڑے بیٹے کی ملک قرار دیئے جانے کو خاندان کی بقاء، بہبود اور اس کی آرزوؤں کی تکمیل کا ضامن سمجھا ہے۔ یہی صورت ہمیں دیگر انسانی بنائے ہوئے قوانین حتیٰ کہ حامیانِ جمہوریت کے قوانین میں بھی ملتی ہے۔ لیکن اسلام مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دولت کو ورثاء کی مشترکہ میراث قرار دیتا ہے جو ان کے درمیان تقسیم ہو گی، اور یہ ورثاء معین ہیں۔ اگر کسی شخص کا کوئی قریبی یا دور کا وارث نہ ہو تو اس کے کل ترکہ کا وارث بیت المال ہو گا، اور اس طرح آخر کار یہ مال عوامی خزانہ میں واپس چلا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت خواہ کتنی ہی ہو بہرحال اسلام کے نظامِ میراث کے تحت تین مرتبہ تقسیم کے بعد بالکل اسی طرح بٹ جاتی ہے جس طرح کمانے سے قبل پھیلی ہوئی تھی۔ شارع نے کسی شخص کو نہ متبنیٰ بنانے کی اجازت دی ہے نہ وصیت کے ذریعہ تہائی دولت سے زائد عطا کرنے کی۔ اگر کوئی کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا بھی لے تو تو بھی وہ اُس کے مرنے کے بعد ایک تہائی کے اندر ہی لے سکے گا۔ ہاں ہمہ اسلام انسان کو یہ حق دیتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وہ اگر چاہے تو اپنی زندگی میں اپنی ساری دولت کسی کو بخش دے، بشرطیکہ اس کی یہ بخشش پس ماندگان کے اعتراض کی موجب نہ ہو۔

کیا یہ اس بات کی بڑی دلیل نہیں ہے کہ اسلام نے سماجی انصاف قائم کرنے کے لئے تمام امکانی وسائل اختیار کئے، اور ان لغزشوں سے گریز کیا ہے جو کمائی کی جدوجہد کی راہ میں لوگوں کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں۔ اس مرحلہ پہ اسلام لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین سے صرف نتیجہ میں ہی نہیں بلکہ ملکیت کے تصور میں بھی اختلاف کرتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ فرانسیسی قانون کی رو سے ملکیت مالک کا ایک دوامی حق ہوتی ہے جو کسی معین وقت کے ساتھ محدود نہیں ہوتی اسی وجہ سے اس کے مرنے کے بعد اس کی ملک میں تصرف کا اختیار صرف ان لوگوں کو منتقل ہوتا ہے جن کو وہ اپنا وارث قرار دے یا جن کے حق میں وصیت کر جائے، اس کے برعکس اسلام میں حقِ ملکیت دوامی نہیں۔ اسی لئے مالک کے مرتے ہی اس کی ملکیت ختم ہو کر اس کے ورثاء کی ملک ہو جاتی ہے جن کے نام شریعت نے خود متعین کر دیئے ہیں۔ اسی بنا پہ اگر مریض اپنے مال میں ایک تہائی سے زائد کی وصیت کرے تو ورثاء کی اجازت کے بغیر وہ قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ اور وہ زائد از ثلث عطیہ ان ورثاء کی طرف سے عطیہ سمجھا جائے گا۔

اگر اس مسئلہ پہ ہم ایک دوسری حیثیت سے نظر ڈالیں تو ہمیں متعدد پہلو ایسے نظر آئیں گے جن کو انفرادی ملکیت اپنی گرفت میں نہیں لیتی، مثلاً جماعتی یا حکومتی اہمیت کے کئی مفاد عامہ کی قسم کے امور ہیں جو انفرادی ملکیت کے ذیل میں نہیں آ سکتے کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ قانونی طور پر [illegible] کئے ہوئے اوقاف کا والی بن جائے۔ اس لئے کہ ان کی نگرانی صرف قانونی والی یا بیت المال [illegible] ہے۔ اسی وجہ سے اوقاف کی معلومات [illegible] کا کوئی اعتبار نہیں [illegible] ایک حصہ ہیں۔ اوقاف کے [illegible] ملکیت [illegible] وہ تمام قومی دولت شامل ہے [illegible] انتظام بیت المال کے ذمہ ہے، مثلاً سڑکیں، شاہراہیں، مختلف قسم کی نہریں، سواحل [illegible] سواحل و اراضی میں پائی جانے والی قدرتی و معدنی دولت، سواحل و اراضی کی آتی تقسیم [illegible] پہ جو ہم بیان کریں گے)، ایسی تمام اراضی یا جن اراضی کے مالکوں کا علم نہ ہو، معدنی ذخائر، لاوارث متوفی کا ترکہ، یا وہ ترکہ جس کا وارث اپنا حق بیت المال کو دے دے، چھاؤنیاں، قلعے، فوجی چوکیاں، پبلک مفاد کے لئے مخصوص کئے ہوئے قطعات و عمارات جیسے سرکاری دفاتر، ہسپتال، گودیاں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دارالامان، پناہ گاہیں، سرکاری مدارس، عدالتیں، پولیس چوکیاں، سپاہیوں کے کیمپ علاج گاہیں اور ان کے علاوہ بہت سی چیزیں ہیں جن کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ ان سرکاری [illegible] عرصے تک قابض رہنے سے نہ تو ان پر سے سرکاری استحقاق ختم ہوجاتا [illegible] کی بنیاد پر اُسے قابضین سے واپس لینے سے [illegible] جا سکتا ہے۔

اوقاف عامہ کا مسئلہ ان اہم مسائل میں سے ایک ہے جن کی [illegible] کو انفرادی ملکیت سے نکال کر تدریجاً اجتماعی ملکیت میں لانے [illegible] جب کہ یہ محض دینی مسائل کے ساتھ خاص نہیں جیسا کہ بعض اغیار نے [illegible] مثلاً تعلیم و تربیت، پلوں اور راستوں کی تعمیر [illegible] مشتمل ہے جن کے ذریعے قوم کے مال داروں کو [illegible] اور گو یہ اوقاف قانونی ولی کی نگرانی میں [illegible] کے زیر نگرانی ہوتے ہیں جو ان کا انتظام اُمت کے دینی و دنیوی مفادات کو [illegible] ان املاک کو ایک طرف تو حکومت کی نگرانی میں [illegible] نے ان تمام تنازعات کو ختم کر دیا ہے جو عام طور [illegible] درمیان پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ [illegible] ہے اور اس کا سربراہ رئیس مملکت یا امیر المومنین ہے [illegible] طرف تو مخصوص مصلحت کی بنا پر واقف کی معینہ شرائط پوری [illegible] کے زیر نگرانی قومی سرمایہ کی حفاظت ہو سکے۔

اسلام کا معاشی نظریہ طبقاتی، قومی اور ملکی حدود سے بالاتر ہے۔ اس لئے [illegible] نفع خوری اور استحصال کو حرام قرار دیتا ہے جس میں حصول زر [illegible] ملت کی قوتِ خرید میں اضافہ کرتا ہے وہیں وہ صارف کی ضرورت سے زائد پیداوار پر بھی [illegible] لگاتا ہے، اس لئے کہ حقیقتاً اب تک قوتِ خرید کی کمزوری ہی کساد بازاری کا سبب بنی ہے جس کی وجہ سے ناروا مقابلہ بازی اور احتکار کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اور ملکی صنعت کو محفوظ رکھنے کے لئے حد سے متجاوز چنگی اور درآمد ٹیکس لگا کر بیرونی مال کی درآمد کو کم کر دیتے ہیں۔ اسلام معقول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقابلہ سے نہیں ڈرتا اس لئے کہ اس طرح تو صارف اور اس کی قوتِ خرید کا معیار بلند ہوتا ہے ، نیز صارف کو زیب و زینت کے جائز وسائل اختیار کرنے میں جدوجہد کا موقع ملتا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ اسلام بہت سے ٹیکس لگانے کو حرام اور اکل اموال الناس بالباطل قرار دے کر اموال منقولہ پر عائد کردہ زکوٰۃ وعشر پر ہی اکتفا کرتا ہے ۔ ماضی میں مسلمانوں کے جملہ معاشی نظام اسی بنیاد پر قائم رہے ہیں اور حکومت کو اس سے نقصان نہیں ہوا ۔ (حالات کی یہ ابتری تو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے سبب ہے جس نے قوموں میں اس حد تک قومی انانیت کو مضبوط کر دیا ہے کہ ساری دنیا متعدد ایسے حصوں میں منقسم ہو گئی ہے جو ہر طرف سے محصور رہیں ، ان میں سے بعض قوموں کی پیداوار کو ضائع کر دیا جاتا ہے جب کہ دوسری طرف بہت سی قومیں تنگدستی اور احتیاج کی زندگی بسر کرتی ہیں ۔ آج ہمارے کانوں میں کچھ ایسی پُرخلوص آوازیں آ رہی ہیں جو تمام انسانیت کے مفاد کی خاطر باہمی نفع بخش تبادلہ کی بنیاد پر دروازے کھولنے پر زور دے رہی ہیں) فاطمی دَور کے مؤرخین نے اس عہد میں مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی حکومت کی مالی واقتصادی ترقیوں کی تفصیلات بیان کی ہیں ۔ جرمن مؤرخ یوسف شاخت نے اپنی کتاب "مرابطین وموحدین کے عہد میں اندلس کی تاریخ" کی جلد اول صفحہ ۱۲۰ (عربی ایڈیشن) میں لکھا ہے :

"یوسف بن تاشفین کے عہد میں مرابطین کی وسیع مملکت میں جو بحرِ اوقیانوس سے مصر تک اور بحیرہ روم سے نائیجر کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی جس میں وہ صحرائے اعظم بھی شامل تھا جسے مرابطین کے قافلے قطع کرتے رہتے تھے نیز اسپین میں دریائے ایبرو سے آبنائے جبل الطارق اور وادی الکبیر کے دہانے تک کے دور دراز علاقوں پر شہروں اور دیہاتوں میں کسی قسم کے ٹیکس ، محصولات اور لگان وغیرہ نہ تھے ، حکومت کی آمدنی تمام تر عشر اور جنگ سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کے خمس اور عطیوں پر مشتمل تھی ۔ اور یقیناً ان مدوں سے بے پناہ رقوم حاصل ہوتی تھیں ۔ یہی وجہ تھی کہ یوسف بن تاشفین نے بڑی دولت چھوڑی جس کا اندازہ کروڑوں تک لگایا گیا ہے ۔"

کیا ان تمام واقعات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسلامی روح کے مطابق قائم کیا ہوا معاشی نظام ہی سماجی انصاف قائم کرنے اور طبقاتی فرق کو دُور کرنے کا سب سے بہتر اور کامیاب ترین طریقہ ہے ؟ ۔

[redacted]

© rasailojaraid.com